عبدالمنعم الازہری
مترجم: ڈاکٹر محمد ریاض

۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے عواقب اور مسلمان

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو المعارف اپریل و مئی ۱۹۷۳)

۱۹۰۵ میں وائسرائے لارڈ کرزن نے صوبہ بنگال کو ہندو اور مسلمان اکثریت کے دو جداگانہ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ امر مسلمانوں کے لیے باعثِ اطمینان تھا۔ کیونکہ اس طرح انھیں ایک نمائندہ حیثیت مل رہی تھی اور اس سے یہ امید پیدا ہو رہی تھی کہ برصغیر کے دوسرے صوبوں میں بھی مسلمان اپنے حقوق حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور تقسیم بنگال کی جدوجہد میں کامیابی ان کے لیے نشانِ راہ ثابت ہوگی۔ نواب سلیم اللہ خاں نے فرمایا تھا: "اس تقسیم سے مسلمانوں میں جنبش و جوش پیدا ہوا۔ ان کے سرد جذبات میں دوبارہ تپش و حرارت آنے لگی تھی"۔

تقسیم بنگال سے مسلمان جس قدر خوش تھے، ہندو اس سے کہیں زیادہ ملول تھے متعصب ہندو، جو ہندو مت کے احیا کا خواب دیکھ رہے تھے، انھیں مسلمانوں کا تشخص ایک آنکھ نہ بھایا۔ وہ مسلمانوں کے لیے دُور رس فوائد کو بھانپ گئے تھے۔ اس لیے تقسیم کی تنسیخ کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگے۔ ہندو مسلم اختلاف، انگریزوں کو عزیز تھا۔ سرکاری ترجمان اخبار اسٹیٹسمین نے لکھا تھا: "تقسیم بنگال کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی ایک ایسی قوت وجود میں آ جائے جو اس صوبے میں برہمنوں کی روز افزوں قوت کا جواب دے سکے"۔

کانگرس کے ہندو اور مسلمان ارکان، اس تقسیم کے خلاف تھے۔ محمد علی جناح، جو اس وقت کانگرس کے رکن تھے، اس تقسیم کے سخت مخالف تھے۔ پروفیسر عقاد نے لکھا ہے: "باعثِ استعجاب ہے کہ برصغیر کی تقسیم کا عظیم فرمان، اس وقت ایک صوبے کی تقسیم کا سخت مخالف تھا۔ مگر یہ وہ دور تھا جب جناح، ہندو مسلم اتحاد کے "سفیر" کہلاتے تھے۔ چند سال بعد ہندوؤں نے بمبئی کے ایک بہت بڑے لال کو ان کے نام سے منسوب کیا۔ جب

اس ہال کا افتتاح ہوا تو جناح اس وقت پیرس میں تھے۔ رسم افتتاح ہندو شاعرہ سروجنی نائیڈو نے انجام دی اور جناح کو ایک تار کے ذریعے خبر دی گئی کہ :

" ہمیں آپ کی زندگی میں ہی آپ کی قدر و منزلت معلوم ہے۔ یہ اسی کا اظہار ہے "۔ اس ہال کی تختی پر لکھا گیا تھا : " محمد علی جناح کی خدمات کے اعتراف میں یہ ۱۹۱۸ میں تعمیر کیا گیا "۔[1]

بہر طور، بنگال کی تقسیم ہندو مسلم آویزش کا سبب بنی۔ انگریز خوش تھے کہ اس عمل سے وہ مسلمانوں کو اپنا ہمنوا بنا لیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ اس تقسیم کی وجہ سے شاید مسلمان اپنی روایتی انگریز دشمنی چھوڑ دیں گے۔ مگر تقسیم کا عمل زود گزر ثابت ہوا۔ کانگرس اور ہندو اکثریت کی سخت مخالفت کے پیش نظر انگریزوں نے ۱۹۱۱ میں تقسیم کی تنسیخ کا اعلان کر کے مسلمانوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ نواب سلیم اللہ خان نے اس موقع پر فرمایا تھا :

" بدنہاد اور متعصب ہندو مسلمانوں کا معمولی فائدہ برداشت نہ کر سکے۔ مسلمانوں کے کرب ناراضگی اور ان کے معنوی نقصان کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس واقعہ سے مسلمانوں کی نظر میں حکومت کا مقام و مرتبہ اور وقار بے حد کم ہو گیا ہے۔ اہم فیصلے اس طرح منسوخ نہیں ہوتے ہیں "۔

اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انگریزوں کے اس شش سالہ کھیل نے مسلمانوں کو بے حد مایوس کر دیا تھا۔

مسلمان اب بھی مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کی جداگانہ حیثیت کو پیش نظر رکھا جائے اور مرکزی و صوبائی اداروں میں انھیں نمایندگی دی جائے۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے لیے نشستیں تقسیم کرنے کا مطالبہ تسلیم کر لیا، تاکہ وہ ہندوؤں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ یہ انگریز کی مصلحت اندیشی تھی تاکہ اس طرح ایک بڑے گروہ کو خوش رکھ سکیں۔ الحاج نواب محمد اسمٰعیل نے ۱۰ اگست ۱۹۱۰ کو نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھا تھا :

" وائسرائے کے خصوصی معاون نے مجھے ایک خط لکھا ہے کہ مسلمانوں کا نمائندہ وفد وائسرائے سے مل سکتا ہے۔ اس وفد میں سب صوبوں کے نمائندے شامل ہوں اور مطالبات کو لوگوں

---

[1] پروفیسر محمود عباس العقاد، " محمد علی جناح " ص ۱۰۲، ۱۲۴، ۱۲۵۔

کے دستخطوں کی تائید حاصل ہو۔ مسلمان یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ یہاں انگلستان کے انتخابات کے علی الرغم، مسلمانوں کے جداگانہ دینی تقاضوں کے پیش نظر، مخصوص نشستوں کی بنیاد پر انتخابات کرائے جائیں تاکہ مسلمان اپنے نمائندے منتخب کر سکیں اور اس کے ماسوا یوں ہی عام انتخابات میں شرکت پر مجبور نہ ہوں۔"

اس خط پر عمل کیا گیا۔ مسلمانوں نے مطالبات کی فہرست تیار کی اور اس پر دستخط ثبت کیے۔ وفد کی سربراہی کے لیے سر آغا خان کو لکھا گیا کہ انگلستان سے تشریف لائیں۔ وہ انگریزی سرکار کی نظر میں بے حد محترم تھے۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور اکتوبر ۱۹۰۶ میں وفد نے شملہ میں وائسرائے سے ملاقات کی اور مسلمانوں کے مطالبات پیش کر دیے گئے۔

مسلمان اب تک مخالفتِ انگریز کی پالیسی پر عمل پیرا رہے تھے۔ یہ ملاقات ایک طرح کی ہمکاری و تعاون کی پیش کش تھی۔ اب تک مسلمان وائسرائے سے کسی اجتماعی مطالبے کی خاطر نہیں ملے تھے۔ اس ملاقات نے ایک طرف انگریزوں کے رویے میں تبدیلی پیدا کی اور دوسری طرف ہندوؤں اور اربابِ کانگرس کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مسلمان ایک قوت ہیں اور وہ اپنے حقوق منوانے کی خاطر آواز اٹھا سکتے ہیں۔ انگریزی پریس نے بھی اس تبدیلی کے بارے میں خاطر خواہ لکھا۔ اس صورت حال کو آغا خان مرحوم نے اپنی معروف "یادداشتوں" میں خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ ہم یہاں ان کی تحریر کے اقتباسات پیش کریں گے۔

"۱۹۰۴ کے بعد دو سالوں کے واقعات نے ثابت کر دیا تھا کہ کانگرس مسلمانوں کو اہمیت دینے سے منکر اور ان کے مطالبات کی طرف توجہ دینے سے قاصر تھی۔ اس طرح مصنوعی ہندو مسلم اتحاد ختم ہو رہا تھا۔ ہندوؤں کا تعصب، اختلافات کی خلیج کو وسیع تر کیے جا رہا تھا، بنگال و پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اور اگر ان صوبوں میں سے مسلمان نمائندے منتخب ہونے کے بارے میں ہندو اتفاق کر لیتے تو اختلافات میں کمی واقع ہو سکتی تھی، مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ انھوں نے مسلم اقلیت کے صوبوں، مدراس اور بمبئی سے مسلمانوں کو غیر مؤثر نمایندگی دلوائی اور یہ بات مسلمانوں کے دلوں کو صاف نہ کر سکی۔ کانگرس کے بہی خواہوں کو اس کی متعصب پالیسیوں سے رنج تھا مگر وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اس ضمن میں مسٹر گوکھلے کی مخلصانہ کوششوں کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

کئی مسلمانوں کو بھی اس روش سے تکلیف ہو رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کانگرس مسلم قیادت کو اپنے ساتھ ملا لیتی تو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وہ بہتر مشورے پیش کر سکتے ۔۔۔ اور حصولِ حقوق کی منازل سب کے لیے سہل ہو جاتیں اور انگریزی حکومت کی مخالفت بھی مؤثر ہوتی۔"

"میں دوستوں سے ملنے علی گڑھ گیا تھا۔ وہاں نواب محسن الملک سے ملاقات ہوئی۔ سرسید احمد خان کے ارتحال کے بعد تحریک علی گڑھ کے وہی اہم ستون تھے جن سے تبادلۂ خیال کرنا مناسب تھا۔ ان کا اور میرا خیال کانگرس دشمنی کا نہ تھا۔ 'اگر کچھ دو کچھ لو' کی پالیسی پر عمل کیا جاتا، تو اختلافات نابود یا بہت کم ہو سکتے تھے۔ مگر افسوس کہ کانگرس کے ارکان نے کوئی توجہ نہ کی۔ پہلے فضا بہتر نظر آتی تھی، مگر جب انتخابات قریب آئے تو پھر مخالفانہ باتیں شروع ہو گئیں۔ ابھی ۱۹۰۶ کا آغاز نہ ہوا تھا کہ مجھے اور نواب محسن الملک اور دیگر مسلمان راہنماؤں کو یہ رائے قائم کرنا پڑی کہ مسلمانوں کو اپنی جداگانہ حیثیت منوانے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے کوشش تیز تر کرنا چاہیے اور اس طرح حکومتِ ہند کو مجبور کر دینا چاہیے کہ وہ مسلمانوں کا جداگانہ تشخص تسلیم کر لے۔"

"ارباب کانگرس نے مسلمانوں کے شور و شغب اور غیظ و غضب سے صرفِ نظر کیا۔ صرف مدراس اور بمبئی میں چند نام نہاد اور کاسہ لیس مسلمان نمائندوں کو منتخب کروایا اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں نمائندگی دینے پر راضی نہ ہوئے۔ میں ۱۹۰۶ کے موسم گرما میں انگلستان چلا آیا تھا۔ برصغیر سے دوستوں نے مجھے لکھا کہ اب حکومتِ ہند کو احساس ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا معاملہ ایک اہم معاملہ ہے اور اس کو کسی نہ کسی طرح حل کرنا چاہیے۔ یہ بات باعثِ خوشی تھی۔"

"۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے بعد جب سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے حکومت برطانیہ نے ہند کی زمام اقتدار تھامی، مسلمان مقہور و مغضوب تھے، کیونکہ جنگِ آزادی میں ان ہی نے زیادہ حصہ لیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ سیاست و اقتصاد میں پس ماندہ تھے۔ جدید علوم و فنون اور انگریزی زبان سے بخوبی آشنا اشخاص مسلمانوں میں انگشت شمار تھے۔ مغلیہ خاندان کے حکمرانوں سے نسبتِ قرب کی بنا پر مسلمان خود دار اور وضعداری کے پابند تھے۔ وہ خلوت دوست اور دوری پسند اور قانع تھے۔ ان کی دو نسلیں مغلیہ سلطنت کے زوال کے غم کو نہ بھلا سکیں۔ ہندوؤں کے لیے صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ وہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے اور انگریز سرکار کی سرپرستی

سے خوب استفادہ کر رہے تھے۔ مدتوں یہی صورت رہی۔ ہندو اکثریت ہر معاملے پر چھائی رہی۔ آخرکار وائسرائے لارڈ منٹو نے کچھ تجاویز مان لیں۔ بعد میں مارلے منٹو اصلاحات مرتب ہوئیں جنھیں ۱۹۰۹ سے نافذ کیا گیا۔ ان کے نتیجے میں برصغیر کے باشندوں کو کچھ حقوق مل گئے اور وہ اپنے مخصوص معاملات و مسائل کی خاطر آواز اٹھانے کے مجاز ہو گئے۔"

"نئے تجربات نے ہمیں سکھا دیا تھا کہ کانگرس سے نباہ ناممکن ہے۔ اس لیے ۱۹۰۶ میں ہم نے وائسرائے سے رجوع کیا کہ ہمارے حقوق کے تحفظ کا یقین دلایا جائے۔ ہم جداگانہ انتخابات اور صوبوں اور پورے ملک میں نمائندگی کے طالب تھے، ہم نے یہ مان لیا تھا کہ مسلمان اکثریت کے دو صوبوں بنگال اور پنجاب میں ہندوؤں کے لیے اضافی نشستیں رکھی جائیں مگر افسوس کہ ہندو ہمیں کوئی رعایت دینے کے روادار نہ تھے۔ وائسرائے نے ہمارے مطالبات ماننے اور ہمارے حقوق کا تحفظ کرنے کا وعدہ کیا۔ لارڈ منٹو نے بعض مطالبات مان لیے اور اس طرح ہماری جداگانہ سیاسی فکر اور اساسِ حقوق مضبوط ہونے لگی۔ ہمارے یہ اقدام، قیام پاکستان کی کوششوں کے راہنما بنے ہیں۔ ان دنوں ہماری کوششوں کا سخت مخالف ایک مسلمان لائق وکیل تھا: محمد علی جناح، یہ شخص ۲۵ سال تک ہندو مسلم اتحاد کی خاطر کام کرتا رہا۔ مگر ہندوؤں کی حماقت اور ان کے برملا تعصب کی بنا پر یہ شخص کوشش اتحاد سے بیزار بلکہ مایوس ہو گیا۔"

آغا خاں نے مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت مسلم لیگ کے بارے میں اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے:

"۱۹۰۶ میں ہم نے وائسرائے سے اہم مذاکرات کیے۔ اس وقت میں اور نواب محسن الملک اس امر پر متفق تھے کہ مسلمانوں کی ایک نمائندہ سیاسی جماعت کا وجود ضروری ہے۔ دیگر مسلمان راہنماؤں کی بھی یہی رائے تھی۔ اسی احساس کے مطابق آئندہ اجلاس کے لیے جب لوگ ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ خان کے ہاں جمع ہوئے، تو یہ جماعت مسلم لیگ، قائم کر دی گئی۔ مجھے اس جماعت کا صدر منتخب کیا گیا اور ۱۹۱۲ تک مجھے یہ فرائض انجام دینے پڑے۔"

حصولِ حقوق کے لیے اتحاد

ایک امریکی مصنف ہنٹر نے اپنی تالیف "دنیائے اسلام کی موجودہ حالت" میں

لکھا ہے :

" بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں برِ صغیر میں ہندِ قدیم کے احیا کی ایک تحریک آریا سماج وجود میں آئی۔ اس تحریک کے کارکن ہندومت کی اصلاح کے پردے میں ویدی نظام کی تجدید اور خالص ہندو حکومت کے قیام کی خاطر کوشاں تھے۔ یہ خفتہ برہمائی حس بیدار کرنے کی سعی تھی۔ روشن خیال ہندوؤں تک نے مغربیت ترک کرکے ہندومت سے دوبارہ ناطہ جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ یہ لوگ غیر ہندوستانیوں کے انخلا کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اس اصطلاح (غیر ہندوستانیوں) میں انگریزوں کے ساتھ مسلمان بھی شامل تھے۔ مسلمانوں کو اس انتہاپسند گروہ سے خطرہ نظر آرہا تھا۔ منٹو مارلے اصلاحات کے تحت اچھوتوں کو جنھیں ہندو نجس مانتے تھے، کچھ حقوق مل گئے تھے اور ان کو بھی یہ احساس تھا کہ آریہ سماجی برسرِ اقتدار آکر ان کے حقوق کو بھی پامال کریں گے۔ اس لیے وہ بھی ان کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے۔[۲]

مسلمان، آریہ سماجیوں کی کوشش پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ انگریزوں کو بھی توجہ دلا رہے تھے کہ ان متعصبانہ سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔ ادھر اچھوت بھی مسلمانوں سے تعاون کر رہے تھے تاکہ آریہ سماج کی سرگرمیوں کا جواب دے سکیں۔ ہندوؤں کے تعصب اور ویدانی عہد کی تجدید کی کوشش نے مسلمانوں کو حصولِ حقوق کے لیے اور زیادہ سرگرم بنا دیا۔ ہندوؤں کے ان تعصبات اور نامعقول اوچھے ہتھیاروں ہی نے بعد میں مسلمانوں کو ایک جداگانہ وطن 'پاکستان' کے قیام کی خاطر متحد کر دیا۔ بھارت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مرتبہ ان ہندوؤں سے جو دار المصنفین اعظم گڑھ کی مالی اعانت کی مخالفت کر رہے تھے، خطاب کرتے ہوئے کہا تھا :

" ایسی ہی کوتاہ اندیشیوں اور کم ظرفیوں نے برِ صغیر کو تقسیم کروا دیا ہے۔"[۳]

۲۔ امیر شکیب ارسلان۔ حواشی۔ مترجمہ عجاج نویہض۔

۳۔ ابوالحسن علی ندوی، المسلمون فی الہند۔

آل انڈیا مسلم لیگ

اوپر ہم نے مسلمانوں کی اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کا ذکر کیا ہے۔ اسی جدوجہد کے نتیجے میں چند زعما ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ کو نواب سلیم اللہ خاں کے دولت کدہ واقع ڈھاکہ میں جمع ہوئے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ایک نمائندہ سیاسی جماعت کے قیام کا اعلان کیا۔ اس اجتماع کی صدارت کے فرائض نواب وقار الملک نے انجام دیئے تھے۔ قیامِ مسلم لیگ کے اہم ترین مقاصد تین تھے:

۱۔ مسلمانوں کے جملہ حقوق کا تحفظ اور ان کے مطالبات حکومتِ ہند کے گوش گزار کرنا۔

۲۔ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان غلط فہمیاں دُور کروانا اور حصولِ حقوق کے لیے حکومت سے مفاہمت پیدا کرنا۔

۳۔ دوسرے مذاہب و ادیان کے لوگوں کے معاملات میں مداخلت نہ کرنا اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا۔

اس جماعت کا قیام ایک اہم قدم تھا۔ اس طرح حقوق کی جدوجہد کے لیے آواز اٹھانے کی ایک مجتمع قوت ہاتھ آ گئی تھی۔

مسلم لیگ چند سالوں تک مقبولیت حاصل نہ کر سکی اور اس کی کئی ایک وجوہ تھیں:

مسلم لیگ کا ایک طرح کا مقابلہ کانگرس سے تھا جسے قائم ہوئے ۲۰ برس گزر چکے تھے۔ اور مطالبے منوانے کی خاص تکنیک سیکھ رکھی تھی۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر قائم کی گئی تھی اور کانگرس کا دعویٰ تھا کہ وہ سب گروہوں کی نمائندہ جماعت ہے مسلم لیگ کی افادیت کے بارے میں عام مسلمانوں کو قائل کرنا آسان نہ تھا۔ کانگرس اپنی مخالف حکومت پالیسی اور بعض مطالبات منوا لینے کی بنا پر خاصی مقبول تھی۔ مسلم لیگ نے حکومت سے مفاہمت پیدا کرنے کا اعلان کر دیا تھا اور اس وجہ سے اس کو بہت دشواریاں پیش آئیں۔ بہت سے مسلمان، انگریزوں کے سراسر خلاف تھے، وہ اس صدائے مفاہمت پر بالکل لبیک نہ کہہ سکے۔ بعض انگریز دشمن مسلمان کانگرس میں شامل تھے اور وہ مسلم لیگ کی سخت مخالفت کر رہے تھے۔ البتہ 'ہندو مہا سبھا' کے قیام نے مسلم لیگ کی اہمیت کو بڑھا دیا۔

ہندو مہاسبھا

یہ گروہ مذکورہ آریا سماج کی مانند متعصب اور ویدی آئین کے احیا کا مبلغ تھا۔ اس نے ہندوؤں کو رزم جو و رجز خواں بنا رکھا تھا اور آئے دن ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے اس گروہ کی شہ پر بعض گستاخ اور منہ پھٹ مصنف مسلمانوں، مسلمانوں کے مذہبی شعائر اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لکھ رہے تھے۔ ان کے بزدلانہ اور ناجوانمردانہ حملوں نے مذہبی اقلیتوں کو متحد کر دیا۔ مسلمان بھی مؤثر آواز اٹھانے کی خاطر مسلم لیگ کا رخ کرنے لگے۔ اس طرح ہندو مہاسبھا نے کانگرس اور مسلم لیگ کے مقاصد کو نمایاں کر دیا۔ مسلمان اب بالعموم مسلم لیگ کے حامی بن گئے تھے۔ اختلافات کے باوجود کانگرس اور مسلم لیگ استعماریت کی مخالفت پر متفق تھیں۔ اگرچہ یہ جماعتیں کئی معاملات میں اتحاد کرتی رہیں مگر تقسیم ملک اور قیام پاکستان کے مطالبے کے وقت ان کی راہیں جداگانہ ہو گئیں۔

مسلم لیگ کی حمایت و مخالفت

مسلم لیگ کے ارکان، حکومت کی کسی قدر حمایت سے اپنے حقوق منوانے کی کوشش کر رہے تھے اور کانگرس بھی اس معاملے میں پیچھے نہ تھی مگر مسلمانوں کا ایک مؤثر گروہ اس روش کے خلاف تھا۔

مسلمانوں کے اس گروہ کی نظر میں انگریز غاصب تھے اور غاصب سے حقوق و مراعات کی دریوزہ گری کرنا شہامت و جوانمردی کے خلاف تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ غاصب کو یہاں سے نکال کر دم لو۔ ان کی نظر میں غاصب حکومت کے ساتھ کسی قسم کا تعاون کرنا شرعاً حرام تھا۔ یہ دعوتِ جہاد تھی۔ اس دعوت کے سرخیل مولانا محمود حسن تھے۔ آپ دار العلوم دیوبند کے پہلے فارغ التحصیل طالب علم تھے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسے ممتاز علما کے شاگرد رہ چکے تھے۔ اور یہ لوگ ان علما میں تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی میں اسلحہ لے کر شرکت کی تھی۔ ایسے علما کی صدائے حق، کارگاہِ استعمار میں انفجار اور دھماکے سے کم نہ تھی۔ مولانا محمود حسن نے راہِ آزادی میں قید و بند اور جلا وطنی کی سزا پائی، مگر افسوس کہ ان کا مقام و مرتبہ ابھی لوگوں کی نظر سے اوجھل ہے۔ ان کے

بعض معاصرین مرتبے میں ان سے فروتر ہیں، مگر شہرت میں افزوں۔ بھارت کے مؤرخین نے تو تلک جیسے لوگوں کو مبارزانِ حریت میں جگہ دے دی۔ مسلمان مؤرخ بھی افراط و تفریط کا شکار ہیں الا ماشاء اللہ۔ مگر ہمیں اطمینان ہے کہ مولانا محمود حسن جیسے بزرگوں کا اجرِ جزیل خدا کے ہاں ہے۔ دنیوی شہرت کی انھیں ضرورت نہ تھی۔

مولانا محمود حسن "شیخ الہند" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۲۰ میں جب وہ جلا وطنی سے واپس ہوئے، تو ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ اور استقبال کرنے والوں میں گاندھی جی بھی شامل تھے۔ شیخ الہند کی دعوت، ترکِ موالات، انگریزی مدارس سے اجتناب[1] اور جہاد قرآن مجید کے اس حکم کے تحت تھا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ [2]

اے مومنو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

آپ مسلم دشمن ہندوؤں اور انگریزوں سے دُوری کی تلقین کرتے تھے۔ انھیں سرکار انگریزی کے القاب کے قبول کرنے سے ابا تھا اور وہ مسلمانوں کو غیرت دلاتے رہے کہ ان القاب کو یکسر ترک کر دیں۔ ہندو ان کے ترکِ موالات کے اعلان سے خوش تھے۔ ان کی سرکردگی میں آگے بڑھے اور اس تحریک کو گاندھی جی کے نام سے منسوب کرنے لگے حالانکہ ترکِ موالات کی ابتدا سید احمد شہید بریلوی کی تحریک سے ہو چکی تھی۔ گاندھی جی ہنوز پیدا نہ ہوئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کی اکثریت ایک طرح کی عدم تعاون کی پالیسی پر عمل پیرا رہی۔ گاندھی جی کا فرانسیسی سوانح نگار رومان رولاں (ROMAIN ROLAND) لکھتا ہے:

"تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات مسلمانوں کے دم قدم سے چلی ہیں۔ گاندھی نے بعض مصالح کی بنا پر ان تحریکوں میں شرکت کی مگر اپنی ملائم روش کی بنا پر نہ انگریزی مال کا بائیکاٹ

---

[1] جامعہ ملیہ دہلی کی درسگاہ ان ہی کے حسب ارشاد قائم ہوئی۔

[2] سورۃ ممتحنہ)

کر سکے اور نہ ان میں راست اقدام کرنے کی ہمت تھی - ان کا منفی اور بے زور رویہ غیر مؤثر رہا - ۱۹۱۹ء تک وہ بلند بانگ دعووں کے باوجود حکومت کے وفادار اور مطیع رہے - بعد کے حالات میں انھوں نے مسلمانوں کی رہبری کرنے کی ناکام سعی کی اور وہ بھی اس لیے کہ انگریزوں کی کوتاہ اندیشیوں نے انھیں مخالفت پر مجبور کر دیا تھا[۵۴] بہر طور، اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے جملہ عواقب میں مسلمان سینہ سپر رہے اور مسلم و غیر مسلم مؤرخوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ حق، حقدار کے لیے مخصوص کریں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی جد و جہد کو صحیح صورت حال میں جانچیں اور پرکھیں -

---

۵۴ - دوہاں رولاں، "مہاتما گاندھی" ترجمہ: محمد قاضی، تہران، ص ۹۰

مسلمانوں کے سیاسی افکار

از: پروفیسر رشید احمد

مسلمان مفکروں نے سیاسی نظریہ سازی کی تاریخ میں بہت اہم ابواب کا اضافہ کیا ہے - اس کتاب میں مختلف زمانوں اور مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے مسلمان مفکروں اور مدبروں کے سیاسی نظریات پیش کیے گئے ہیں - یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے - پہلے باب میں قرآنی نظریۂ مملکت کی بخوبی وضاحت کی گئی ہے جو ان سب مسلمان مفکروں کے نظریوں کی اساس ہے -

یہ کتاب بی - اے کے نصاب میں داخل ہے -

صفحات: ۸+۳۲۴ قیمت: ۶/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور